Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں تھوڑا بہت اضافہ ہونے لگا۔ سال بھر ایاز اسی طرح پڑھائی میں غرق رہا اور میٹرک اس نے فرسٹ ڈویژن میں پاس کر لیا۔ سکول میں اس کی پوزیشن دوم رہی۔ سکول کے آخری سال کی ایک شکل میرے ذہن کے اندر ایاز کے گھر کی بیٹھک کی سی ہے، جس میں سے نکل کر ہم دونوں نے میٹرک پاس کیا تھا۔

کالج میں ایاز نے سائنس لی اور میں نے آرٹس۔ جہاں تک طالب علمی کا تعلق ہے، کالج کے پہلے دن سے ایاز کی ترقی کا اور میری تنزلی کا زمانہ شروع ہوا۔ ہمارے گھر کی اچھی خاصی زمینداری تھی۔ کسی زمانے میں ہمارے دادا پردادا نے شہر کے آس پاس کافی زمین خرید لی تھی۔ یہ زمین اب آباد ہو چکی تھی۔ اس کے علاوہ شہر کی آبادی بڑھتے بڑھتے ہماری زمین کے بیچ پہنچ گئی تھی۔ ہماری زمین کی حیثیت زرعی سے شہری اور رہائشی میں بدل گئی تھی، جس سے اس کی قیمت میں چند سال کے اندر دس گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ میرے والد نے آبادی کے ساتھ لگتی ہوئی کچھ زمین بیچ دی اور باقی میں کاشت کرتے رہے۔ چنانچہ کالج میں پہنچ کر میں قدرتی طور پر ایک ایسے گروپ میں شامل ہو گیا جو زیادہ تر آس پاس کے دیہات سے آئے ہوئے زمینداروں کے لڑکوں کا گروپ تھا۔ ان لڑکوں کو تعلیم سے کچھ سروکار نہ تھا۔ انہیں پتا تھا کہ آخرِ کار زندگی میں زمینداری کی جا ب لوٹنا ہے، اور جسے زمینداری کی فارغ اور پُرکشش زندگی میسر ہو وہ تعلیم اور نوکریوں کے چکر میں کیوں پڑے۔ چنانچہ یہ لوگ یہاں پر چند سال کے لیے شہری طالب علمی کی زندگی سے لطف اندوز ہونے کی غرض سے آتے تھے، اور کالج میں انہیں کھیل، اتھلیٹکس، الیکشن اور جتھے بندیوں کی حد تک دلچسپی ہوتی تھی۔ ہم دوسرے سال میں تھے کہ یونین کے الیکشن کے سلسلے میں کالج کے اندر دو گروہوں میں لڑائی ہو گئی، جس کے نتیجے کے طور پر تین لڑکوں کو رسٹی کیٹ کر دیا گیا۔ بدقسمتی سے ان تینوں میں ایک میرا نام بھی تھا۔ یہاں آ کر میری طالب علمی کا زمانہ ختم ہوا۔ میں نے اپنے والد کے ساتھ زمینوں کی دیکھ بھال میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ ایک آدھ سال کے بعد میرے والد نے سارا کام کاج میرے حوالے کیا اور خود گویا دنیا سے کنارہ کر بیٹھے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ان کا دن آدھا مسجد میں ، آدھا چچا رشید کی آڑھت کی دکان پر اور اماں سے میری شادی کے بارے میں بات چیت کرنے میں صرف ہوتا۔ ایاز نے اسی دوران میں اوّل نمبر پہ رہ کر ایف ایس سی۔ پاس کی اور وظیفہ لے کر لاہور چلا گیا۔ جب کبھی وہ گھر آتا تو میری اس سے ملاقات ہوتی۔ چھٹیوں کے دوران ہفتے میں ایک آدھ بار وہ ضرور مجھ سے ملنے کے لیے آتا۔ مگر ہماری ملاقاتیں مختصر ہوتی گئیں۔ ایک تو وہ شہر سے باہر چلا گیا تھا، دوسرے میری مصروفیات اب بڑھ گئی تھیں، اور نئی مصروفیتوں کے ساتھ نئی نئی دوستیاں پیدا ہو چکی تھیں۔ چنانچہ ہم دونوں کو اس بات کا علم تھا کہ ہماری زندگیوں نے مختلف رخ اختیار کر لیے ہیں، ہمارے درمیان اب وہ بات نہیں رہی۔ اس کے باوجود جب بھی ہم ملتے کچھ دیر کے لیے بچپن کی طویل دوستی کی تمام تر گرم جوشی اور ہم رازی ہمارے دلوں میں امڈ آتی، اور ہمیں محسوس ہوتا کہ اگرچہ یہ سچ ہے کہ اب وہ بات نہیں رہی، مگر جہاں پر بھی وہ بات ہے وہاں سے اسے مٹا نہیں سکتا۔

جس روز ایاز کا نتیجہ نکلا اس سے اگلے دن میں بازار سے گزر رہا تھا کہ میری نظر ایک اخبار پر پڑی۔ پہلے صفحے پر دو تین چھوٹی چھوٹی تصویریں چھپی تھیں۔ ان میں ایک ایاز کی تصویر بھی تھی۔ میں نے اخبار خرید کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایاز نے بی۔ ایس۔ سی۔ کے امتحان میں گولڈ میڈل حاصل کیا ہے۔ میں وہاں سے سیدھا اس کے گھر پہنچا۔ ایاز کی ماں اپنے چند رشتہ داروں اور بہت ساری محلے کی عورتوں میں گھری ان کی خاطر مدارت کر رہی تھی اور خوشی سے پھولی نہیں سماتی تھی۔ بیٹھک میں ایاز اپنے تین خالہ زاد بھائیوں اور دو ایک دوستوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اس کے بھائی افتخار نے دکان بند کر دی تھی اور تازہ تازہ مٹھائی کی ٹوکریاں لا کر اندر اور باہر مہمانوں کے سامنے رکھ رہا تھا۔ میں نے ایاز کی ماں اور اس کے بھائی کو مبارک باد دی اور ایاز سے شکایت کی کہ اس نے مجھے بتایا کیوں نہیں۔

"یار ابھی تو لاہور سے آیا ہوں۔" وہ بولا۔

میں نے بیٹھ کر منہ میٹھا کیا۔ کوئی آدھ گھنٹہ گپیں مارنے کے بعد ایاز اچانک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مجھ سے بولا: "چلو یار باہر چلیں۔"

ہم اٹھ کر باہر نکل آئے۔ بازار میں پہنچے تو میں نے پوچھا: "زمین پر چلتے ہو؟"

"ہاں۔" ایاز خوش ہو کر بولا۔ مجھے احساس ہوا کہ وہ اس سارے جمگھٹ سے دور کہیں جانا چاہتا ہے۔ گھر میں بیٹھا بیٹھا وہ اچانک خاموش ہو گیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کا خیال امتحان کے نتیجے کی خوشی کو اپنے آپ میں جذب کر کے کسی اور طرف کو نکل گیا ہے۔ شہر سے باہر ہم دیر تک کھیتوں میں پھرتے رہے۔ پھر ہم ڈیرے پہ جا کر بیٹھ گئے۔ اس روز ایاز نے بہت کم باتیں کی۔ مگر ایک بات مجھے اچھی طرح یاد ہے۔

"میں لا کالج میں داخلہ لے رہا ہوں۔" اس نے بتایا۔

ہم سب یہ سوچے ہوئے بیٹھے تھے کہ ایسے شاندار نتیجے کے بعد ایاز کو ایم۔ ایس سی۔ کے لیے وظیفہ ملنا تو یقینی تھا، بعد میں گورنمنٹ کے خرچے پر پی ایچ ڈی وغیرہ کے لیے ولایت بھیجے جانے کا بھی امکان تھا۔ پھر واپس آ کر سرکاری ملازمت میں اس کا مستقبل سیدھا سادا تھا۔ کسی دوڑ دھوپ، سفارش یا دردسری کی ضرورت نہیں تھی۔ چند سال میں ترقی کرتا ہوا وہ اعلےٰ عہدے پر پہنچ جائے گا۔ قانون پڑھنے کی بات کر کے اس نے مجھے حیران کر دیا۔

"سکالرشپ مل جائے گا؟" میں نے پوچھا۔

"لا کالج کے لیے شاید نہ ملے۔"

"پھر؟"

"کسی نہ کسی طرح گزارہ ہو ہی جائے گا۔" وہ بولا۔

"مگر ایاز!" میں نے پوچھا، "سائنس میں اتنی محنت کرنے کے بعد لا کالج کی کیا تُک ہے؟"

"محنت کہاں کی ہے یار۔" وہ ہنس کر بولا، "گولڈ میڈل میں کیا کمال ہے۔ ذرا عقل استعمال کرنے کی ضرورت ہے بس۔ سائنس پڑھ کر کیا کروں گا۔ کالج میں پڑھانے لگ جاؤں گا، یا کسی لیبارٹری میں اگلے تیس سال تک گھسا رہوں گا کولھو کے بیل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی طرح، آنکھوں پر کھوپے چڑھائے، نہ اندر کی خبر نہ باہر کی۔ میں تو دنیا کے کاموں میں حصہ لینا چاہتا ہوں۔" وہ اپنے دونوں بازو ہوا میں پھیلا کر بولا، "باہر نکل کر پھرنا چاہتا ہوں، جہاں ساری زندگی کا چکر چلتا ہے۔ آدمی کی آدمی سے بات ہوتی ہے، دوستی اور دشمنی ہوتی ہے، فایدہ اور نقصان ہوتا ہے۔ عقل اور بے عقلی کی لڑائی ہوتی ہے، زندگی اور موت کا سودا ہوتا ہے۔ اصل میدان تو وہ ہے۔"

اس کی بات میرے دل کو انوکھی مگر سچی لگی۔ اپنے ساتھ کے جتنے لڑکوں کو میں جانتا تھا ان میں سے کسی نے کبھی ایسی بات نہ کی تھی۔ ہم سب ایسے لوگ تھے جن کے سامنے کوئی واضح مقصد نہ تھا۔ جس طرف کو بھی ماں باپ نے، یا حالات نے دھکیل دیا اسی طرف کو چلتے گئے، جو کچھ سامنے آگیا اسی کو پکڑ لیا (یا اس نے ہمیں پکڑ لیا) اور وقت نکلتا گیا۔ جب ایک راستہ خود بخود بند ہو گیا تو جو نیا راستہ سامنے آیا اسی پر چل پڑے۔ ایاز پہلا ایسا لڑکا تھا جسے قطعی طور پہ پتا تھا کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے، جس نے طے شدہ رستہ چھوڑ کر ایک نیا رستہ اپنے لیے تلاش کیا تھا۔ مجھے یاد ہے اس وقت میرے دل میں ہلکا سا حسد کا جذبہ پیدا ہوا تھا۔

"ٹھیک ہے بھئی۔ ہمارے لیے تو اچھا ہی ہے۔" میں نے ہنس کر کہا تھا، "کبھی ہمارے کام بھی آؤ گے۔"

اسی سال ایاز نے لاء کالج میں داخلہ لے لیا۔ اسے سکالرشپ ملا یا نہیں، اب مجھے ٹھیک سے یاد نہیں۔ مگر افتخار کی دکان اب چلنے لگی تھی، اور مجھے پتا تھا کہ وہ ایاز کو خرچہ بھیجتا رہتا تھا۔ ایاز اپنے ایک رشتے کے ماموں کے ہاں کرشن نگر میں رہتا رہا۔ اس کا کمرہ اتنا چھوٹا تھا کہ مشکل سے اس کی چارپائی کمرے میں آتی تھی۔ اس کے علاوہ صرف ایک چھوٹی سی میز کونے میں فٹ کی ہوئی تھی جو کتابوں سے لدی تھی۔ مزید کتابیں فرش پر، کھڑکی میں، چارپائی پر، غرضیکہ ہر جگہ اوپر نیچے پڑی ہوئی تھیں۔ ایاز کے کپڑے دیوار پر اور دروازے کے پیچھے کیلوں سے ٹنگے تھے۔ وہ چارپائی پر بیٹھ کر لکھا پڑھا کرتا تھا۔ ایک بار میں کسی کام کی غرض سے لاہور گیا تو ایک رات ایاز کے پاس ٹھہرا تھا۔ اس وقت سے مجھے اس کمرے کا نقشہ یاد ہے۔ ہم دونوں اس گھر کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بیٹھک کے فرش پر رات کو سوئے تھے۔ اس رات ہم دیر تک بتی بجھا کر اندھیرے میں باتیں کرتے رہے۔ لا کالج میں ایاز کا دوسرا سال تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ یونین کا سیکرٹری منتخب ہو گیا ہے اور کالج کے میگزین کا ایڈیٹر بھی بن گیا ہے۔ اسے شکایت تھی کہ اس نے اپنے ذمے اتنے کام لے لیے ہیں کہ اس کی پڑھائی کا حرج ہو رہا ہے۔ مگر مجھے دل میں یقین تھا کہ ایاز اگر یہ کام اپنے سر نہ لیتا تو اسے کبھی اطمینان نصیب نہ ہوتا۔ انہیں دو تین سالوں کے اندر پہلے میرے والد کا انتقال ہو گیا، پھر اماں نے میری شادی کر دی۔ ان دو واقعات کے بوجھ تلے میرے اندر کچھ ذہنی تبدیلیاں پیدا ہونی شروع ہو گئیں۔ میں اچانک پڑھنے لکھنے کی طرف راغب ہونے لگا۔ ایاز چھٹیوں میں گھر آیا ہوا تھا کہ ایک روز صبح سویرے وہ مجھے ڈھونڈتا ہوا شہر سے باہر ہمارے ڈیرے پر آ پہنچا جہاں میں کچھ کام کروا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ادبی پرچہ تھا جس میں میری ایک کہانی چھپی تھی۔ اس کے چہرے پر حیرت کے آثار تھے۔ وہ پرچے کے ورق الٹ الٹ کر دیکھ رہا تھا اور ان پر ہاتھ مار مار کر حیرت اور بے یقینی اور خوشی کا اظہار کر رہا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں نے اسے بتائے بغیر کیسے اور کب اور کیوں اور کہاں کہانیاں لکھنی شروع کر دی تھیں جو کہ چھپنا بھی شروع ہو گئی تھیں۔ میں نے اسے بتایا کہ یہ میری پہلی کہانی ہے اور میں نے اور کوئی کہانیاں نہیں لکھیں۔ یہ سن کر اسے اور بھی زیادہ حیرت ہوئی۔ ہم دیر تک ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر ہنستے رہے۔

"یہ پرچہ تمہارے ہاتھ کیسے لگا؟" میں نے پوچھا۔

"میں اسے باقاعدگی سے پڑھتا ہوں۔" ایاز نے بتایا۔ "لاہور سے اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔ آج اس کہانی کی باری آئی ہے۔"

کہانی میں نے اپنا نام ذرا بدل کر چھپوائی تھی۔ میں نے پوچھا کہ اس کو کیسے پتا چلا کہ یہ میری کہانی ہے۔

"یار یہ ہمارے شہر کی کہانی ہے۔" وہ ہنس کر بولا۔ "ہمارا بازار اور ساری گلی اس میں موجود ہے۔ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اسے نہ پہچانوں۔ اس میں میری شکل تک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

موجود ہے۔

اس دن کے بعد میرے اور ایاز کے درمیان گویا ایک نئی دوستی کا آغاز ہوا۔ وہ جب بھی اپنے شہر کو لوٹتا تقریباً ہر روز مجھ سے ملنے کے لیے آتا۔ لاہور میں ہوتا تو ہفتے دو ہفتے میں ایک بار خط لکھتا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس نے میرے اندر ایک نیا آدمی دریافت کر لیا تھا جو اس کا بچپن کا دوست ہونے کے علاوہ اس کی جوانی کا ساتھی بھی تھا۔ اب وہ میرے ساتھ ہر قسم کی باتیں کرنے لگا تھا، وہ باتیں جو شاید وہ اب تک صرف اپنے لاہور کے دوستوں سے کیا کرتا تھا۔ ادب کی اور سیاست کی باتیں، دوسرے ملکوں کی، دنیا کے حالات کی، مردوں اور عورتوں کی گہری گہری پیچیدہ باتیں جن سے اس کا بے چین دل اور دماغ اپنی خوراک حاصل کرتا تھا۔ بعض دفعہ مجھے احساس ہوتا تھا کہ وہ اس شہر سے اکتا گیا ہے، جیسے اس شہر میں اب اس کے لیے کوئی دلچسپی کا سامان نہیں رہا، اس کا خیال اس چھوٹے سے شہر سے نکل گیا ہے، اور وہ احساسِ تنہائی سے بچنے کے لیے مجھ سے ملنے اور باتیں کرنے آتا ہے۔ مگر اس خیال سے مجھے اندر ہی اندر فخر اور خوشی کا احساس بھی ہوتا تھا۔

ایل۔ ایل۔ بی۔ کر کے ایاز اپنے شہر کو لوٹ آیا۔ اس نے امتیازی حیثیت سے امتحان پاس کیا تھا۔ اس نے بتایا کہ اسے ایک مشہور وکیل کے ساتھ کام کرنے کی پیش کش ہوئی تھی، مگر اس نے اس پیش کش کو قبول نہیں کیا اور اپنے شہر واپس آنے کو ترجیح دی ہے۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا، "یہاں پیسہ نہیں ہے، مگر ابتدائی تجربے کے لیے اضلاع سے بہتر کوئی جگہ نہیں ہے۔ یہاں چھوٹے سے لے کر بڑے تک سب انسانی جھگڑوں سے آدمی کا واسطہ پڑتا ہے، اور چھوٹے بڑے سرکاری اہل کاروں کی ذہنیتوں کا علم ہوتا ہے۔ میں ہائی کورٹ میں کسی بیرسٹر کا کام چلانے کے لیے اس کا کارندہ کیوں بنوں؟ اپنی کچہری میں پیپل تلے کرسی ڈال کر" وہ ہنسا، "اپنا کام کیوں نہ کروں؟"

ہم لوگوں کی صورت اب یہ تھی کہ ہم ایاز کی کسی بات میں اس کے ساتھ سوال جواب نہیں کرتے تھے۔ دوستوں اور گھر والوں کی حیثیت اب محض تماشائی کی سی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چنانچہ اگلے دو سال تک ایاز اپنے شہر میں گمنام سی پریکٹس کرتا رہا۔

اس کی پریکٹس کا نقشہ ہو بہو وہی تھا جو پہلے روز ایاز نے میرے سامنے کھینچا تھا۔ شہر کے دو ایک بڑے وکیل تھے جن کے دفتر ان کی کوٹھیوں میں واقع تھے۔ باقی کے وکیل کچہری کے احاطے سے کام چلاتے تھے۔ کچہری میں پیپل اور برگد کے متعدد پرانے پرانے سایہ دار درخت تھے پچھلے چند برسوں کے دوران شہر کے نوجوان وکیلوں کی تعداد میں خاصا اضافہ ہو گیا تھا۔ اب نوبت یہاں تک آ پہنچی تھی کہ وکیلوں کی تعداد کار آمد منشیوں کی تعداد سے کہیں بڑھ چکی تھی۔ چنانچہ ایک منشی دو دو اور تین تین وکیلوں کا کام بھگتاتا تھا۔ منشی، وکیلوں کی لکھت پڑھت کے علاوہ ان کی دلالی کا کام بھی کرتے تھے، اور تقریباً سب منشی نئے نئے نوجوان وکیلوں (اور کئی پرانے ناکام وکیلوں) سے زیادہ کمانے لگے تھے۔ ایاز نے بھی ایک تھرڈ کلاس مجسٹریٹ کی عدالت کے سامنے پیپل کے پیڑ کے نیچے اپنی کرسی اور میز جمالی اور ایک تجربہ کار منشی کی پارٹ ٹائم خدمات حاصل کر لیں۔ ایک ڈیڑھ سال کے بعد جب اس کی پریکٹس کچھ چل نکلی تو اس نے اپنے منشی کو ہٹا کر ایک نوجوان عرضی نویس کو اپنا منشی رکھ لیا۔ وکالت کے حلقے میں یہ ایک غیر معمولی قدم تھا جو ایاز نے اٹھایا تھا۔ اوّل تو عرضی نویس کو منشی (وکیلوں کے منشیوں کو دیہاتی لوگ عموماً "وکیل صاحب" کہہ کر مخاطب کرتے تھے) سے کم درجے کا کارندہ سمجھا جاتا تھا، اور کسی عرضی نویس کو منشی بننے کے لیے اس حلقے کی جانب سے سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ دوم یہ کہ اس پیشے کے سربراہ، یعنی وکیل حضرات بھی پیشوں کی اس تقسیم کو عین درست سمجھتے تھے، گو اس میں ان کا براہِ راست کوئی فائدہ یا نقصان نہیں تھا۔ مگر یہ وہ لوگ تھے جو اپنے پیشے کی روایات کے ساتھ سختی سے چمٹے رہنے میں ہی اپنی سلامتی سمجھتے تھے۔ (قانون کی مضحکہ خیز زبان پہ ایک نظر ڈالنے سے یا کسی وکیل کو قانون کی رین میخ نکالتے ہوئے سن لینے سے اس نکتے کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ اکثر اوقات معلوم یہ ہوتا ہے کہ قانون دان انصاف کی بجائے قانونی شقوں کے محافظ بنتے جا رہے ہیں۔) ایاز اس وقت بھی قانون کے دائرے کے اندر رہ کر ان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چھوٹی موٹی روایتوں کو توڑتا رہتا تھا۔ منشی کے بارے میں اس کا کہنا تھا کہ ایک نوجوان آدمی کو لے کر خود اس کو کام سکھلانا کسی گھاگ منشی پر انحصار کرنے کی نسبت ہر حال میں بہتر ہے۔ انہی دنوں میں نے شہر سے باہر زمین کے ایک قطعے پر اپنے لیے نیا مکان بنوانا شروع کر رکھا تھا۔ میرا زیادہ تر وقت وہیں پر صرف ہوتا تھا مگر کبھی کبھی مجھے کسی دوست یا واقف کار کی خاطر کچہری جانا پڑتا تو میں وقت نکال کر ایاز سے ملنے چلا جاتا۔ اس کی کرسی عموماً خالی ہوتی۔ وہ تمام دن عدالتوں میں مصروف رہتا تھا۔ ایسے موقعوں پر میں ایاز کی کرسی پر بیٹھا منشی سے گپیں لگاتا رہتا۔ ایاز ایک عدالت سے فارغ ہو کر آتا تو پانچ دس منٹ میرے پاس بیٹھ کر اٹھ جاتا اور اگلے مقدمے کو نبٹانے چلا جاتا۔ میرے کام کے سلسلے میں اگر اس کی مدد کی ضرورت ہوتی تو وہ ساتھ چل کر کام کروا دیتا۔ دو ایک اور وکیلوں سے بھی میری واقفیت تھی۔ کچہری میں ان سے ملاقات ہو جاتی تو وہ اکثر مجھ سے کہتے، "چوہدری، تم لوگ تو عیش کرنے کے لیے پیدا ہوئے ہو۔ باپ دادا کی کمائی تمہاری تین پشتوں کے لیے کافی ہے۔ ہماری طرف دیکھو، روزگار کے لیے تحصیل داروں کی عدالت میں جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں۔" ایاز میرا بچپن کا دوست تھا، مگر اس نے مذاق میں بھی مجھ سے کبھی ایسی بات نہ کی تھی۔ اس کے اندر رشک یا حسد نام کا کوئی جذبہ موجود نہ تھا۔ اسے دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ اس شخص کا مقام کہیں اور ہے، اس کی نگاہ اس کی نظر سے کہیں دور جاتی ہے۔ کبھی کبھی اتوار کے روز وہ اپنی فائلیں وغیرہ اٹھا کر باہر میرے ڈیرے پہ آنکلتا۔ جب وہ آتا تو اس کے پاس اپنی فائلوں کے علاوہ عموماً کسی ادبی پرچے کا نیا شمارہ ہوتا۔ وہ دن بھر چارپائی پہ بیٹھا یا لیٹا اپنا کام کرتا اور میں رسالہ پڑھتا رہتا۔ بیچ بیچ میں ہم اٹھ کر کھاتے پیتے، باتیں کرتے اور کھیتوں میں گھومنے کے لیے چلے جاتے۔ ایاز کو نئے اور پرانے ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں گفتگو کرنے کا بہت شوق تھا۔ یہ اکلوتا موضوع ایسا تھا جس کے لیے وہ میری بات کو دھیان سے سنتا اور میری رائے کو اپنی رائے پر ترجیح دیتا تھا۔ ایسے موقعوں پر اس کے چہرے کا انہماک دیکھ کر مجھے حیرت ہوا کرتی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہ یہ شخص کتنی مختلف قسم کی دنیاؤں میں رہتا ہے۔ ایک دنیا اس کا گھر، اس کا محلّہ، اس کے رشتے دار اور اس کے بچپن اور لڑکپن کا ماحول تھا جس میں سے نکل کر وہ جوان ہوا تھا۔ دوسری اس کے کام کی دُنیا تھی جو سراسر ذہانت اور اعتماد پر قائم تھی۔ تیسری دنیا ادب کی تھی جس کی دہلیز پر وہ مسلسل کئی برس سے کھڑا اندر جھانک کر دیکھ رہا تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ لاہور میں کالج کے میگزین میں اس نے کئی مضمون لکھے تھے۔ مگر جب سے وہ کام میں پڑا تھا اسے کچھ لکھنے لکھانے کا وقت ہی نہیں ملتا تھا۔ اکثر مجھے خیال آتا کہ ایاز اگر وکیل نہ بنتا تو ایک بہت عمدہ ادیب ہوتا۔ وہ برابر اپنے پرانے مکان میں اپنی ماں اور چھوٹی بہن سلمیٰ کے ساتھ رہتا آ رہا تھا۔ افتخار کی شادی ہو گئی تھی اور ایک سال تک اسی گھر میں رہنے کے بعد وہ اور اس کی بیوی دکان کے اوپر چوبارے میں منتقل ہو گئے تھے۔ شہر میں کمپنی باغ کے اندر چھوٹا سا کلب تھا جس میں شہر کے چھوٹے بڑے افسران اور وکیل شام کے وقت اکٹھے ہو کر ٹینس، ٹیبل ٹینس اور تاش وغیرہ کھیلا کرتے تھے۔ عام خبر تھی کہ وہاں شراب بھی ملتی ہے اور جُوا بھی ہوتا ہے۔ ایاز کبھی اس کلب میں شریک نہیں ہوا تھا۔ جب کبھی میں شام کو ملنے کے لیے اس کے گھر جاتا تو وہ اپنی چھوٹی سی بیٹھک میں میز پر کاغذات پھیلائے بیٹھا اپنا کام کر رہا ہوتا۔ ایک آدھ بار اس نے سرسری طور پر ذکر کیا تھا کہ وہ شہر سے باہر اپنے لیے ایک مکان بنوانا چاہتا ہے، جس پر میں نے اسے زمین کا ایک ٹکڑا مفت مہیا کرنے کی پیشکش کی تھی۔ جواب میں ہنس کر اس نے صرف اتنا کہا تھا، "یار میرے پاس ان کاموں کے لیے ابھی وقت کہاں ہے۔" دو سال کی پریکٹس کے بعد وہ ایک ایسے مقام پر کھڑا تھا جہاں صرف اس کے دوستوں کو ہی نہیں، بلکہ ساری وکیل برادری کو اس بات کا احساس تھا کہ اگر وہ اسی طور پر چلتا رہا تو عنقریب ان سب کو پیچھے چھوڑ جائے گا۔ ان دو برسوں میں میں نے دوسرے وکیلوں کا ایاز کی جانب رویّہ اور ان کے بات کرنے کا انداز تک دن بدن بدلتے ہوئے دیکھا تھا۔ ایک افواہ یہ بھی تھی کہ اسے سرکاری ملازمت میں سول جج وغیرہ کے عہدے پر تقرری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پیش کی جائے گی۔ مگر اس مقام پر پہنچ کر ایاز نے اچانک اپنی زندگی کو ایک اور بریک لگائی اور اس کا رخ ایک ایسی جانب موڑ دیا جس کا کوئی متوقع نہ تھا۔ ایک دن اس نے مجھے بتایا کہ وہ بار ایٹ لار کرنے ولایت جا رہا ہے۔

"میرے گھر والوں کے بعد تم پہلے آدمی ہو جسے میں نے یہ بات بتائی ہے" وہ بولا، "ابھی بات باہر نہ نکلے۔ اماں کو اس بات کی خبر نہ تھی، وہ کچھ پریشان ہیں۔ میرے ایک رشتہ دار وہاں رہتے ہیں۔ ابا کے پھوپھی زاد بھائی ہیں شاید۔ کئی مہینے سے میں ان سے خط و کتابت کر رہا تھا۔ انہوں نے میرے داخلے وغیرہ کا بندوبست کیا ہے۔"

میری زندگی کے معدودے چند مناظر ایسے ہیں جو میرے ذہن پہ ہمیشہ کے لیے نقش ہیں۔ ان میں ایک منظر یہ بھی ہے۔ اگست کا مہینہ تھا۔ ایاز اپنا چمڑے کا اٹیچی کیس اٹھائے دروازے میں کھڑا رخصت ہو رہا تھا۔ اس کی ماں اس سے لپٹی اونچی آواز میں رو رہی تھی اور اس کے سر اور چہرے اور چھاتی پہ ٹٹول ٹٹول کر ہاتھ پھیرتی جا رہی تھی، جیسے اس کی شکل کو اپنی انگلیوں کے حافظے میں محفوظ کر لینا چاہتی ہو۔ گلی کے سب گھروں سے لوگ باہر نکل آئے تھے۔ مرد ایاز کے گھر کے سامنے اسے رخصت کرنے کو اور عورتیں اور بچے اپنے اپنے گھروں کے دروازوں میں چپ چاپ کھڑے اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ جب افتخار نے ایاز کے ہاتھ سے اس کا اٹیچی کیس لے لیا اور ہم سب گلی میں چل پڑے تو ایاز کی ماں گلی میں نکل آئی اور ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر بین کرنے لگی۔ ایاز نے کہا تھا کہ وہ تین سال تک واپس لوٹ آئے گا، اور ہم اسی طرح اس کو رخصت کر رہے تھے جیسے کسی کو ایک لمبے سفر پہ بھیجا جاتا ہے۔ مگر اس وقت صرف اس کی ماں کو شاید یہ علم تھا کہ ایاز ہمیشہ کے لیے اپنے شہر سے رخصت ہو رہا ہے۔

ایاز پورے پانچ برس کے بعد انگلستان سے لوٹا۔ جب وہ واپس آیا تو لاہور میں ہی رک گیا۔ وہاں سے اس نے اپنی ماں اور بہن بھائی کو بلا بھیجا۔ چند روز میں وہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایاز سے مل کر لوٹ آئے۔ افتخار نے مجھے بتایا کہ وہ اور اس کی ماں اور بیوی بچے اور سلمےٰ اور اس کا خاوند سب لوگ کرشن نگر میں ٹھہرے تھے جب کہ ایاز اپنے ایک دوست کی کوٹھی میں ٹھہرا ہوا ہے۔ افتخار میرے نام ایاز کا خط لے کر آیا تھا۔ خط میں ایاز نے میرا حال چال پوچھا تھا اور مجھے لاہور آ کر ملنے کی سخت تاکید کی تھی۔ انگلستان میں قیام کے دوران پہلے دو سال تک ایاز مجھے خط لکھتا رہا تھا، جن میں اس ملک کی نئی نئی عجوبہ باتیں بیان کی ہوتی تھیں۔ میرے جیسے آدمی کے لیے جس نے کبھی ایک آدھ روز سے زیادہ عرصے کے لیے اپنے چھوٹے سے دیہاتی شہر سے باہر قیام نہ کیا تھا، ان خطوں میں انتہائی کشش اور ذہنی سفر کی سی کیفیت ہوتی تھی۔ مجھے اس کے خطوں کا انتظار لگا رہتا تھا۔ جب اس کا خط آتا تو میں کئی کئی بار اسے پڑھتا، پھر اپنے دوستوں کو پڑھ کر سناتا۔ ہم سب کئی کئی روز تک ایاز کے خطوں کی باتیں کرتے رہتے۔ گو میں اور میرے دوست نوجوانی کی منزل پار کر چکے تھے اور تقریباً سب کے سب بیوی بچوں والے تھے، مگر انگلستان کی میموں کی کشش نے ہمارے خیالات کو پریشان کر رکھا تھا۔ ایاز نے کبھی اپنے خطوں میں کسی میم کے ساتھ اپنے ذاتی تعلقات کا ذکر نہ کیا تھا، مگر ہمیں ان خطوں سے میموں کی بُو آیا کرتی تھی۔ ایک بار میرے ایک دوست سلیم نے، جو مخنی سا آدمی تھا اور جس کی دیرینہ خواہش تھی کہ وہ موٹا تازہ ہو جائے، ایک پرانے انگریزی رسالے میں کسی دوا کا اشتہار پڑھا۔ یہ ایک قسم کی گولیوں کا اشتہار تھا جن کے بارے میں لکھا تھا کہ ان کے کھانے سے شرطیہ طور پر بدن موٹا اور پٹھے طاقتور ہو جاتے ہیں۔ سلیم کے اصرار پر میں نے ایاز کو لکھا کہ اگر وہ یہ گولیاں خرید کر بھیج سکے تو اس کی مہربانی ہو گی، اور یہ کہ دوا کی قیمت سلیم افتخار کو دے دے گا۔ اندر سے مجھے یقین نہیں تھا کہ ایاز میرے کسی دوست کے لیے وہاں سے اتنا تردد کرے گا۔ مگر دو مہینے کے اندر گولیوں کی بوتل ایک نفیس پارسل کی شکل میں مجھے مل گئی۔ (سلیم کو ان گولیوں سے کوئی فائدہ نہ ہوا، بلکہ الٹا وہ سخت بیمار پڑ گیا۔) دو سال کی خط و کتابت کے بعد ایاز کے خط آنا بند ہو گئے۔ اپنے آخری خط میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس نے ذکر کیا تھا کہ اسے وہاں پہ پیسوں کی کچھ دقت ہو رہی ہے، مگر اس نے لکھا تھا کہ اس کو جو بھی کرنا پڑا، اس کا پکا ارادہ تھا کہ اپنی تعلیم کو مکمل کر کے آئے گا۔ اس کے بعد میری طرف ایاز کا کوئی خط نہیں آیا۔ صرف اپنی ماں کو وہ باقاعدگی سے ہر دوسرے ہفتے خط لکھتا رہتا تھا، جن میں اکثر میری طرف سلام دعا کا پیغام ہوتا تھا۔ چنانچہ جب میں اس سے ملنے کے لیے لاہور پہنچا تو میرے دل میں کئی قسم کے ملے جلے خیالات تھے۔ مجھے یقین تھا کہ ایاز بہت حد تک بدل چکا ہوگا۔ اس خیال کو تقویت اس بات سے بھی ملی تھی کہ اس نے اپنے گھر تک آنا گوارا نہیں کیا تھا بلکہ لاہور ہی میں رک گیا تھا۔ مگر جب میرا ایاز سے آمنا سامنا ہوا تو یہ سارے خیالات میرے ذہن سے رفع ہو گئے۔ وہ مجھ سے اسی پرانی گرم جوشی اور اپنائیت کے ساتھ بغل گیر ہوا۔ میں اپنے بڑے بیٹے کمال کو جو اس وقت چھ سال کا تھا اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ ایاز دیر تک اسے گود میں بٹھائے اس سے باتیں کرتا رہا۔ صرف دو ایک ظاہری تبدیلیاں ایاز میں پیدا ہوئی تھیں۔ اس نے بہت بڑھیا قسم کا گہرے رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا، اور اس کے سیاہ جوتے اتنی صفائی سے پالش کیے ہوئے تھے کہ ان میں سے منہ دکھائی دیتا تھا۔ بات چیت میں وہ اب انگریزی کے الفاظ، بلکہ جملے کے جملے کثرت سے استعمال کرنے لگا تھا۔ اس کے اٹھنے بیٹھنے کے طور میں کسی حد تک نفاست اور رکھ رکھاؤ کا احساس ہوتا تھا۔ مگر جہاں تک اس کی ذات کا تعلق تھا، میں نے اس کے اندر کوئی تبدیلی نہ پائی اور نہ ہی مجھے، ابتدائی چند لمحوں کے بعد، کسی اجنبیت کا احساس ہوا۔ اس نے اپنے دوست اظہر سے میرا تعارف کروایا۔ ایاز اور اظہر ایک ساتھ بار ایٹ لا کر کے انگلستان سے لوٹے تھے۔ اظہر کے ساتھ میرا کچھ غائبانہ تعارف اس زمانے سے بھی تھا جب انگلستان سے ایاز کے خط مجھے آیا کرتے تھے۔ ان خطوں میں اکثر اظہر کا ذکر ہوتا تھا۔ ایاز نے انگلستان میں اپنے ابتدائی دنوں کے چند مزاحیہ واقعات، جن میں اظہر کا حصہ بھی تھا اور جو ایاز نے مجھے خطوں میں لکھے تھے، مجھے یاد دلائے، اور ہم تینوں انہیں دہرا کر ہنستے رہے۔ وہ دونوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اُس غیر ملک میں پانچ برس تک ایک ہی مکان کے اندر ساتھ ساتھ کے کمروں میں رہتے رہے تھے۔ ایاز نے بتایا کہ اب وہ دونوں اکٹھے اظہر کے والد کی پریکٹس میں شریک ہو رہے تھے۔ شیخ مظہر الدین لاہور کے پرانے بیرسٹر تھے اور ایک مشہور گھرانے سے ان کا تعلق تھا۔ ان کے افرادِ خاندان اعلیٰ سرکاری اور سیاسی عہدوں پہ فائز رہے تھے۔ شہر میں ان کی بہت بڑی پرانے طرز کی کوٹھی تھی جس کی انیکسی میں ایاز ٹھہرا ہوا تھا۔

"میرا تو آپ سے غائبانہ تعارف بہت پرانا ہے۔" اظہر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا، "مگر اب ہمارے گھر میں سب لوگ آپ سے ملنے کے مشتاق ہیں۔" ایاز بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تو وہ اُٹھ کر کتابوں کی الماری کی طرف بڑھا۔ ایک خانے میں سے اس نے ایک کتاب اٹھائی اور وہیں کھڑے کھڑے اس کا سرورق میرے سامنے کر دیا۔ یہ میری کہانیوں کا مجموعہ تھا جو حال ہی میں شائع ہوا تھا۔ ایاز کے ہاتھ میں اپنی کتاب دیکھ کر مجھے ایک عجیب طرح کی خوشی ہوئی۔

"یہ تمہارے ہاتھ کیسے لگی؟" میں نے پوچھا۔

"پانچ سال کے بعد یہ پہلی اردو کی کتاب ہے جو میں نے خریدی ہے۔" وہ خوشی سے بولا۔ "کیا کمال کی کہانیاں لکھی ہیں تم نے۔ ایک رات میں میں نے ساری پڑھ ڈالیں، ان میں سے صرف چار میری پڑھی ہوئی ہیں۔ باقی کی تم نے میرے بعد لکھی ہیں۔"

"ہاں"۔ میں نے کہا۔

"یار۔ اب تو تم بہت مشہور و معروف آدمی ہو گئے۔"

میں ہنس پڑا۔ "یہاں ادیبوں کی شہرت کس بھاؤ بکتی ہے، تم تو جانتے ہی ہو۔"

ایاز اچانک خاموش ہو گیا۔ "ہاں۔" کچھ دیر کے بعد وہ بولا، "مگر ایک نہ ایک دن اس ملک کو ادیب کے منہ کی طرف دیکھنا ہی پڑے گا۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔"

جس وقت ایاز نے یہ بات کی اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ اس کی آواز میں جو ذرا سی تبدیلی آ چکی تھی کچھ دیر کے لیے کہیں غائب ہو گئی تھی۔ اس کا لہجہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کی آواز، ہو بہو وہی آواز تھی جو کئی برس پہلے میرے کانوں میں آیا کرتی تھی جب ایاز اپنے شہر میں پریکٹس کرتا تھا اور کسی کسی اتوار کو ہمارے ڈیرے پر آکر کھیتوں میں گھومتا ہُوا مجھ سے ادیبوں اور شاعروں کی باتیں کیا کرتا تھا۔ ماضی کے زمانے سے آتی ہوئی وہ بے باک ہلکے سے کپکپاتے ہوئے کناروں والی آواز سن کر پانچ برس کی دوری کا عرصہ معدوم ہو گیا اور میرے دل سے رہی سہی اجنبیت بھی نکل گئی۔ ایاز نے باتیں کرتے ہوئے رائے ظاہر کی کہ میری سب سے اچھی کہانیاں وہ تھیں جو میں نے اپنے شہر، اور خاص طور پہ اپنے بچپن اور لڑکپن کے بارے میں لکھی تھیں۔ اس وقت ایاز کی اس بات پہ میں مسکرا کر خاموش ہو رہا تھا۔ مگر ایک عرصہ گزر جانے کے بعد جب مجھے ادب کے بارے میں کسی قدر علم ہوا تو مجھے پتا چلا کہ ایاز کی یہ بات کس قدر سچی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ انگلستان میں قیام کے دوران اس نے قانونی جریدوں میں چند ایک مضامین لکھے تھے، جن میں سے ایک تو خاصا مشہور ہوا تھا، اور اس کے بعض حصے کئی اور جگہوں پہ بھی چھاپے گئے تھے۔ دوپہر کا کھانا ہم نے وہیں پہ کھایا۔ اس روز میری ملاقات اظہر کی بہن نسیم سے بھی ہوئی جو بعد میں ایاز کی بیوی بنی۔ نسیم ایک خوش شکل اور تعلیم یافتہ نوجوان خاتون تھی جو ایک کالج میں انگریزی پڑھاتی تھی۔ گفتگو کے دوران مجھے پتا چلا کہ نسیم بھی ایک تعلیمی ڈیلپمے کے سلسلے میں ایک سال تک انگلستان میں قیام کر کے آئی تھی۔ ان دنوں اس کا بھائی اور ایاز وہیں پہ تھے اور ایاز سے پہلی بار اس کی ملاقات وہاں پہ ہوئی تھی۔ شام کے وقت میں دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے واپس لوٹ آیا۔

میں معمول کے طور پر چار چھ ہفتے میں ایک بار ایاز سے ملنے کے لیے لاہور جانے لگا۔ ایک سال کے بعد اس کی شادی نسیم سے ہو گئی۔ شادی کے بعد ایاز اور اس کی بیوی چند ماہ تک اسی انگیسی میں ٹھہرے رہے، پھر ایاز نے اپنے لیے الگ ایک کوٹھی کرائے پہ لے لی۔ یہ کوٹھی شہر سے ذرا باہر ایک نئی آبادی میں تھی۔ دو سال تک اظہر اور اس کے والد کے ساتھ مل کر پریکٹس کرنے کے بعد ایاز نے ایک اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بڑا قدم اٹھایا۔ اس نے شراکت توڑ کر اپنی الگ پریکٹس شروع کر لی۔ اب میں اس سے ملنے کے لیے جاتا تو اکثر وہ مجھ سے رات بھر رکنے کے لیے اصرار کرتا۔ "اب تو ہمارے پاس کافی جگہ ہو گئی ہے یار۔" وہ کہتا، "تم ایک ہی تو میرے دوست ہو جس کے ساتھ میں ہر قسم کی بات کر سکتا ہوں۔" اور کسی حد تک یہ سچ بھی تھا۔ لاہور میں جتنے لوگ بھی ایاز کے ملنے والے تھے سب اس کے اپنے پیشے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان لوگوں سے ایاز کی ملاقات دن بھر کے دوران مختلف عدالتوں اور بار روم وغیرہ میں ہوتی رہتی تھی۔ اس کے علاوہ ایاز کے پاس ملنے ملانے کا وقت ہی نہیں تھا۔ گھر آنے کے بعد ہر روز رات کو گیارہ بارہ بجے تک وہ اپنے مقدموں کے کاغذات پر کام کرتا رہتا تھا۔ اتوار کو وہ دونوں نسیم کے والدین کے گھر ملنے کے لیے جاتے اور دوپہر کا کھانا عموماً وہیں پہ کھاتے۔ اگر میں وہاں پہ ہوتا تو ان کے ساتھ چلا جاتا۔ ایاز کے سسرال میں گفتگو زیادہ تر ان کے اپنے کنبے یا قانونی پیشے کے بارے میں ہوتی۔ سہ پہر کے وقت ہم ایاز کی سیکنڈ ہینڈ فورڈ کار میں بیٹھ کر دھیمی رفتار سے ڈرائیو کرتے ہوئے واپس آ جاتے۔ پھر ایک آدھ گھنٹہ آرام کرنے کے بعد ایاز اور میں لمبی سیر کو نکل جاتے۔ میرے قیام کے دوران یہی ایک موقع ہوتا جب ہمیں دو ڈھائی گھنٹے کے لیے آپس میں گفتگو کرنے کا موقع ملتا۔ اگرچہ کبھی کبھی میں اس کے اصرار پر رات کو وہاں رک جاتا تھا مگر عموماً ہوتا یہ کہ میں رات کو دیر تک نسیم کے ساتھ باتیں کرتا رہتا، جب کہ ایاز اپنے کمرے میں جا کر کام میں مصروف ہو جاتا۔ پھر صبح کو ناشتے پر ایک آدھ گھنٹہ مزید نسیم سے گپیں لگانے کے بعد ایاز کی غیر موجودگی میں ہی واپس لوٹ آتا۔ ہم اکثر اس بات پہ ہنسا کرتے کہ ایاز میرے وہاں رکنے پر اصرار کرتا ہے اور پھر اپنی روٹین میں مشغول ہو جاتا ہے، گویا میں وہاں پہ موجود ہی نہیں ہوں۔

"ایاز کو بس آپ کی موجودگی سے ہی اطمینان ہو جاتا ہے۔" ایک بار نسیم نے مجھ سے کہا تھا۔ "جیسے اس کے خاندان کا کوئی آدمی گھر میں موجود ہو۔"

نسیم جس ماحول میں پلی بڑھی تھی وہ میرے اور ایاز کے ماحول سے قطعی مختلف

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا۔ مجھے یاد ہے جب میں پہلی بار اپنی بیوی کو ساتھ لے کر ان سے ملنے گیا تھا (اس وقت وہ نئے نئے اپنی کوٹھی میں منتقل ہوئے تھے) تو میری بیوی یہ دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی تھی کہ نسیم ایاز کو "تم" کہہ کر مخاطب کرتی تھی۔ نسیم کے حلقے میں مرد اور عورتیں دونوں شامل تھے، اور وہ مردوں کے ساتھ اسی انداز میں میل جول رکھنے کی اہل تھی جیسے عورتوں کے ساتھ۔ بے تکلفی اور تہذیب کے امتزاج کا یہ ایک ایسا طور تھا جو صرف ایک خاص طبقے سے تعلق رکھنے والی عورتوں کی شخصیت میں پیدا ہوتا ہے اور جو دوسرے طبقوں، خصوصاً نچلے طبقے کے مردوں کے لیے انتہائی کشش کا حامل ہوتا ہے۔ نسیم میں وہ ذہانت موجود نہیں تھی جو ایاز میں تھی، وہ دماغی صلاحیت جو گہری گہری پیچیدہ باتوں کی گرہیں کھولنے کی اہل ہوتی ہے۔ اور نسیم کو اس بات کا علم تھا۔ نسیم نے اس بات کو اپنی سرشت میں اسی طرح قبول کر لیا تھا جس طرح کہ اس نے ہمیشہ سے اپنے گھر کے اندر باپ اور بھائی کے مقابل اپنی فطری حیثیت کا تعین کر لیا تھا۔ مگر اس بات سے اس کی ذات کے اندر کسی کمتری کا احساس پیدا نہ ہوا تھا۔ ایاز جیسے شخص کے لیے، جس نے ایک لمبے عرصے تک اپنے طبقے کے اندر رہتے ہوئے بھی اس کی حدوں کو توڑتے رہنے سے کبھی احتراز نہیں کیا تھا، نسیم کی شخصیت کا یہ رخ غالباً سب سے زیادہ پرکشش تھا۔ نسیم جہاں ایاز کے لیے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتی تھی وہاں اس کے ذاتی اعتماد کی جڑ بھی تھی، گو ہر کسی کی طرح نسیم کی زندگی بھی روزمرہ کی چھوٹی بڑی بے اطمینانیوں سے بھری پڑی تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ اپنے باپ کے گھر انیکسی میں ہی رہے چلی جاتی جو کہ ایک درمیانے سائز کے گھر کے برابر تھی۔ "پریکٹس چھوڑنے کی کیا ضرورت تھی۔" اس نے کئی بار مجھ سے شکایت کی تھی۔ "اتنی بڑی پریکٹس ہے کہ ہر ایک کا گزارہ اچھا خاصا ہو رہا تھا، آگے بھی ہوتا رہتا۔ ہر ایک نے سمجھایا، مگر ایاز کے دماغ میں خبر نہیں کیا سمائی ہے۔ بس یہی ایک رٹ لگا رکھی ہے کہ میری آزادی میں فرق پڑتا ہے، حالانکہ وہاں کسی بات کی رکاوٹ نہیں تھی۔ اب آپ دیکھ ہی رہے ہیں کیا حالت ہے۔ پہلے کبھی کبھار کسی سے ملنے ملانے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کا وقت نکلتا رہتا تھا۔ اب سر کھجانے کی فرصت نہیں ....."

شادی کے بعد بھی نسیم کی زندگی اپنے پرانے دوستوں اور اپنے کنبے کے گرد گھومتی رہی تھی۔ چار سال میں اس کے ہاں دو بیٹے پیدا ہو چکے تھے، چنانچہ اسے اپنی کالج کی ملازمت چھوڑنا پڑی تھی۔ اکثر وہ ایاز کے کورٹ جانے کے بعد بچوں کو ساتھ لے کر اپنی ماں کے گھر علی چلی جایا کرتی اور ایاز کے واپس آنے سے گھنٹہ دو گھنٹہ پہلے لوٹ آیا کرتی تھی۔ "ڈیڈی نے کہا تھا میں تمہیں کار خرید دیتا ہوں۔" ایک بار اس نے مجھے بتایا، "مگر ایاز نہیں مانا۔ پتا نہیں کیوں؟ کہیں کہیں اس کی عقل بالکل ڈھیلی ہے۔ بسوں اور ٹیکسیوں پر سفر کرتے کرتے میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔" ایاز کے گھر والوں سے نسیم کا واسطہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ایسے حالات بیویوں کے لیے نہایت تسلی بخش ہوتے ہیں۔ مگر نسیم کے لیے، جسے دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ اس عورت کی زندگی میں ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کی کوئی اہمیت نہ تھی، یہ بات ناخوشی کا باعث ہو سکتی تھی۔ ایاز کی ماں بیمار رہنے لگی تھی، اور افتخار دکان کا چوبارہ چھوڑ کر اپنے بیوی بچوں کو ماں کی دیکھ بھال کے لیے گھر لے آیا تھا۔ سلمٰے اپنے خاوند کے پاس تھی جو جہلم میں ایکسائز کے محکمے میں ملازم تھا۔ ایاز ہر مہینے دو مہینے کسی اتوار کو چند گھنٹے کے لیے اپنی ماں سے ملنے آجایا کرتا، اور گو ہر بار وہ ماں کو اپنے ساتھ لے جانے پر زور دیتا، اور ہر بار یہ کہتا کہ اس کی بیوی کی بھی خواہش یہ ہے کہ اس کی اماں لاہور آجائیں تاکہ ان کا مناسب علاج ہو سکے، میرے دل میں ہمیشہ یہ شبہ رہا کہ اس نے کبھی فیصلہ کن انداز میں ماں کو اپنے ساتھ لے جانے پہ اصرار نہیں کیا تھا۔ صرف ایک عید کے موقعے پر افتخار، اس کی بیوی اور ماں تین دن کے لیے ایاز کے گھر گئے تھے۔ وہ عید ایاز نے اپنے سسرال کی بجائے اپنے گھر پہ کی تھی۔ ایاز کی ماں وہاں سے اپنی بہو کی تعریفیں کرتی اور اسے دعائیں دیتی ہوئی لوٹی تھی۔ نسیم نے مجھ سے کئی بار ذکر کیا تھا کہ اس کا جی چاہتا ہے کہ ایاز کی ماں، دو چار مہینے کے لیے ہی سہی، ان کے پاس آکر ٹھہرے۔ مگر ایاز کی ماں بضد تھی کہ وہ اپنے شوہر کے گھر سے مردہ ہو کر ہی نکلے گی۔ ایک بات بہرحال مسلّم تھی: نسیم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک بار بھی ہمارے شہر نہیں آئی تھی۔

چار یا پانچ برس کی آزاد پریکٹس کے بعد ایاز کے رہن سہن میں کچھ تبدیلیاں پیدا ہونی شروع ہو گئیں۔ ایاز کی زندگی نے اب تک کئی رخ بدلے تھے، مگر ہر ایک موڑ پر یہ محسوس ہوتا تھا کہ یہ اس کا برسوں پہلے کا مقرر کیا ہوا رخ ہے اور وہ اپنے پروگرام کے عین مطابق چلا جا رہا ہے۔ اس بار بات مختلف تھی۔ اب جو تبدیلیاں اس کے ڈھنگ میں آ رہی تھیں ان کے بارے میں یہ کہنا مشکل تھا کہ اس کے اپنے ارادے کا نتیجہ تھیں یا کہ بدلتے ہوئے حالات کے مطابق خود بخود رونما ہو رہی تھیں۔ ایاز اب چھتیس برس کا ہونے لگا تھا، اور گو اس کی جسمانی صحت بدستور قائم تھی، اس کی شکل و صورت پر اس طویل محنت کے آثار ظاہر ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک روز صبح سویرے کسی خیال میں غرق وہ شیو کے لیے شیشے کے سامنے پہنچا ہو اور ایک لمحے کے واسطے حیران رہ گیا ہو کہ یہ کون ہے جس کا چہرہ کچھ مانوس لگتا ہے؟ اگرچہ زیادہ قرینِ قیاس بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اپنی سرشت کے مطابق اب وہ اس روز مرّہ کے کام سے کچھ اکتا تا جا رہا تھا، اور اس کے خیال میں نہ آ رہا تھا کہ اب کیا کرے، گویا اپنے پروگرام کے اختتام کو پہنچ چکا ہو۔ بے شک اس عمر میں وہ سب کچھ ایاز نے حاصل کر لیا تھا جس کے لیے کوئی بھی "کامیاب" آدمی عمر بھر محنت کرتا ہے۔ اس نے وہ کوٹھی، جس میں وہ کرائے پر رہتا رہا تھا، اس کے مالکوں سے خرید لی تھی۔ گھر میں آسائش کی تمام جدید اشیاء مہیا تھیں۔ اپنے لیے اس نے نئی کار خرید لی تھی اور پرانی نسیم کو دے دی تھی۔ ٹیلیفون موجود تھا۔ خانساماں، بیرا، آیا اور ایک مالی گھر میں ملازم تھے۔ اس کی پریکٹس عروج پر تھی اور اب اس نے گھر پہ کام کرنا کافی حد تک کم کر دیا تھا۔ دفتر میں اس کے دو جونیئر بہت ہوشیار اور محنتی وکیل تھے جو مقدموں کی بریف تیار کرتے اور چھوٹی عدالتوں میں ابتدائی کارروائیاں نبٹاتے تھے۔ ایاز اب صرف سیشن یا ہائی کورٹ میں مقدموں کے دلائل پیش کرتا تھا۔ گھر میں صَرف کرنے کے لیے اب پہلے کی نسبت کافی وقت میسر تھا۔ ان کے دو پیارے بچے تھے، اور آپس میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میاں بیوی کی زندگی نہایت خوش باش اور متوازن تھی۔ ان کے پاس کسی شئے کی کمی نہ تھی۔ اگر کہا جائے کہ ایاز اس وقت تک اپنے تمام تر مقاصد حاصل کر چکا تھا تو غلط نہ ہوگا۔ مگر اس وقت مجھے کیا پتا تھا کہ اس کی زندگی کا اصل دور ختم نہیں، بلکہ اب شروع ہونے والا تھا۔

ایاز اور نسیم نے اب لوگوں سے ملنا ملانا شروع کر دیا تھا۔

ایسے لوگوں کی کمی نہ تھی جو ان کے دوستوں کے حلقے میں شامل ہونے کے خواہش مند تھے۔ ہفتے میں دو تین بار چند دوست یا تو ان کے گھر میں اکٹھے ہوتے اور رات کا کھانا عموماً ساتھ کھایا جاتا، یا ایاز اور نسیم کسی کے گھر ملنے کے لیے جاتے۔ دونوں اپنے دوستوں کے چناؤ میں خاصے محتاط تھے۔ زیادہ تر ملنے والے ایاز کے اپنے پیشے سے تعلق رکھتے تھے، اس کے ہم عمر بیرسٹر اور وکیل جن کے پہلو بہ پہلو ایاز برسوں سے کام کرتا آیا تھا۔ چند ایک نوجوان وکیل تھے جن کی ذہانت اور سنجیدگی سے متاثر ہو کر ایاز نے انہیں اپنے حلقے میں شریک کر لیا تھا۔ مگر آہستہ آہستہ ان کے ملنے والوں میں کئی ایسے لوگ بھی شمار ہونے لگے تھے جن کا تعلق زندگی کے دوسرے شعبوں سے تھا۔ کچھ عرصے سے ایاز نے انگریزی اخباروں میں انٹرنیشنل لاء وغیرہ کے موضوعات پر مضامین لکھنے شروع کر دیے تھے۔ چنانچہ اب اس کی مجلس میں ایسے لوگ بھی دکھائی دینے لگے تھے جن کا ایک قدم اخبار نویسی یا تعلیم و تدریس میں اور دوسرا قدم ادب و سیاست میں تھا۔ اب جب کہ اس بات کو قریب قریب بیس برس کا عرصہ گزر چکا ہے مجھے یہ تسلیم کرنے میں عار نہیں کہ اس زمانے میں ایاز اور نسیم کو اپنے دوستوں میں گھرا ہوا دیکھ کر، ایاز کو ہنستے اور محظوظ ہوتے ہوئے، اور نسیم کو بڑے اعتماد سے ان کے بیچ چلتے پھرتے، کھانے پینے کا بندوبست کرتے اور اپنی دلکشی سے سب کو مسحور کرتے دیکھ کر کئی بار میرے دل میں حسد کا جذبہ پیدا ہوا تھا۔ حالانکہ میرے ساتھ ایاز اور نسیم کے سلوک میں ذرہ برابر فرق نہ آیا تھا۔ بہرحال جوں جوں وقت گزرتا گیا میرے دل سے اس قسم کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خیالات رفع ہوتے گئے۔

کسی آدمی کی زندگی کے بارے میں یہ اندازہ لگانا کہ کس نقطے پہ پہنچ کر اس کا ایک دور ختم اور دوسرا شروع ہوا، ایک مشکل کام ہے۔ لیکن اب میں بیس برس کے اس طویل فاصلے سے اس وقت پہ نظر ڈالتا ہوں تو ایک معمولی سا واقعہ میرے ذہن میں آتا ہے جس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک ایسا مقام تھا جو ایاز کی زندگی میں غالباً سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ میں اس اتوار کو ایاز سے ملنے لاہور گیا ہوا تھا۔ باہر اتنی تپش تھی کہ ایاز اور نسیم نے اس روز معمول کے مطابق نسیم کے والدین کے گھر جانے کا خیال ترک کر دیا اور ہم نے گھر پہ ہی دوپہر کا کھانا کھایا۔ کھانے کی میز پہ ہم دیر تک پنکھے کے نیچے بیٹھے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ جب ہم وہاں سے اٹھے تو ایاز نے مجھ سے کہا "میں تمہیں ایک مضمون دکھانا چاہتا ہوں۔" چند منٹ کے بعد وہ اپنے کمرے سے ہاتھ میں چند ٹائپ شدہ اوراق لیے برآمد ہوا اور مجھے پکڑاتے ہوئے بولا "یہ میں نے لکھا ہے۔ اسے پڑھو۔" میں ایاز سے وہ کاغذات لے کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ ایاز نے پہلے کبھی مجھے اپنا کوئی مضمون نہ دکھایا تھا، نہ ہی مجھے کبھی ان کو پڑھنے کی خواہش ہوئی تھی۔ اوّل تو یہ مضمون خالصتاً قانونی نکتوں سے متعلق ہوتے تھے، دوسرے دقیق قسم کے قانونی لہجے میں لکھے ہوئے ہوتے تھے جس میں جگہ جگہ پہ مختلف تعزیرات، قوانین اور ان کی متعدد شقوں کے حوالے ملتے تھے۔ مگر اس مضمون کو میں نے جیسے ہی پڑھنا شروع کیا، پڑھتا چلا گیا۔ مضمون انسانی حقوق کے بارے میں تھا، اور گو نہایت مدلّل طور پہ تیار کیا گیا تھا اور قانونی حوالوں سے بھرا پڑا تھا، مگر طرزِ تحریر ایسا تھا کہ اس سے قانونیت کے لہجے کی بُو نہ آتی تھی۔ سیدھے سادے عام فہم انداز میں بتایا گیا تھا کہ کیسے انسانی حقوق کے تحفظ کا قانون تمام ملکوں پہ لاگو ہوتا ہے۔ مضمون اس چابک دستی سے تیار کیا گیا تھا کہ عام فہم ہونے کے باوجود اس حد تک وزنی تھا کہ اس پر کسی قسم کی شر انگیزی کا الزام لگانا دشوار تھا۔ تاہم وہ سن اٹھاون کے